اختلاف نہیں کرتے تھے؛ کیونکہ وہ آپس کے ظلم وستم کی راہ میں حائل ہوتی تھی..... حکمران خود تو ظلم کرتے، لیکن لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے نہیں دیتے تھے۔ بس ان بیچاروں کے ٹیکس، بیگار اور دیگر ظالمانہ احکامات کی پاسداری وغیرہ تمام ''In put'' کا ''Out put'' صرف ''امن وامان'' تھا۔ اور یہ بھی ایک بڑی نعمت تھی، جس کی قدر کراچی، بلوچستان، وزیرستان اور گلگت بلتستان کے عوام زیادہ بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔

پاکستان کی موجودہ جمہوری حکومت نے اس علاقے کے لوگوں کو ''**پانچویں صوبے**'' کی شکل میں ایک شناخت دی، اس اعلان کو ہر کسی نے اس امید کے ساتھ سراہا کہ ''ان شـــــاء اللہ'' یہ اقدام دیرینہ محرومیوں کے ازالے کی طرف ''پہلا قدم'' ثابت ہوگا۔ لیکن آئے روز اس امید پر اس قدر پانی پھیرا جارہا ہے کہ جسے واپڈا کے بجلی گھروں پر پھیرا جاتا تو ملک پن بجلی میں خود کفیل ہو جاتا۔

گلگت بلتستان کی حد تک کون نہیں جانتا کہ ''**پانچواں صوبہ**'' ان ستم زدوں کو ''**کتنا مہنگا**'' پڑ رہا ہے! مقامی حکومت کا ''**پہلا تحفہ**'' غریب عوام کے لیے **مذہبی دہشت گردی** ہے۔ اور ''**دوسرا تحفہ**'' ان کی قوت لایموت کو حاصل **سبسڈی کا مرحلہ وار خاتمہ**۔ اور ''**تیسرا تحفہ**'' ابھی پیکنگ کے مرحلے میں ہے اور وہ ہے: **ٹیکس**۔

گزشتہ غیر جمہوری حکومت نے بھی دہشت گردی کا تحفہ دیا، لیکن اہم مقامات پر ایف سی کی ڈیوٹی لگا کر کسی حد تک تحفظ کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی۔ ان میں سے سکردو شہر میں مرکز اسلامی اور مرکز الہدیٰ شامل ہیں۔

مقامی حکومت نے ''**پہلے مرحلے**'' میں بااختیار ایف سی کو ہٹا کر اپنے زیر نگیں **جی بی فورس** مقرر کیا۔ اب ''**دوسرے مرحلے**'' میں اس تکلف کو بھی گراں سمجھ کر **لوکل پولیس** پر ٹرخا دیا ہے۔

موجودہ مخدوش حالات کو سنگین بنانے کے لیے شرپسندوں کی سازشیں بارہا منظر عام پر بھی آرہی ہیں۔ حکومت سے ہماری اپیل ہے کہ سکردو میں 2005ء وغیرہ کے واقعات کو دہرانے سے روکنے کی خاطر مستقل بنیادوں پر باقاعدہ فوجی سکیورٹی فراہم کی جائے۔ جی بی فورس سے بھی تسلی بخش کارکردگی کی توقع نہیں۔ لوکل پولیس تو اب تک کے تجربات کی روشنی میں امن وامان قائم کرنے میں بالکل ناکام ہے۔ اور اس کوتاہی پر انہیں کوئی سزا بھی نہیں ملتی۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ اطمینان بخش سکیورٹی ہر قیمت پر فراہم کی جائے۔

درس قرآن

تراثِ رحمانی در فوائدِ قرآنی

ڈاکٹر اسماعیل محمد امین۔اسلام آباد

قال الله تعالىٰ ﴿ وإذ نجينكم من آل فرعون يسومونكم سوٓء العذاب يذبحون أبنآء كم ويستحيون نسآء كم وفي ذٰلكم بلآء من ربكم عظيم ۞ وإذ فرقنا بكم البحر فأنجينكم وأغرقنآ آل فرعون وأنتم تنظرون ۞ ﴾[البقرة ٤٩-٥٠] ''اور جب ہم نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی جو تمہیں برا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔اور جب ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔''

سابقہ آیات سے ربط اور مختصر تفسیر:

کلام اللہ کا تسلسل بنی اسرائیل کے ساتھ جاری ہے۔اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں کی یاد دلائی۔زیرِ تفسیر آیتوں میں ان پر کیے جانے والے انعامات اور انہیں دی جانے والی فضیلت کی تفصیل شروع ہو رہی ہے۔ یہاں بھی خطاب یہودِ مدینہ سے ہے؛ لیکن مراد ان کے آباء واجداد ہیں، جس کی توجیہ سابقہ آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ارشاد فرمایا: ﴿وإذ نجيناكم ﴾ یہ جملہ سابقہ آیات ''اذكروا نعمتي...... ''پر عطف ہے۔(إذ) ظرف ہے، اس کے معنی یہ ہیں: (اذكروا إذ) ''اس وقت کو یاد کرو جب'' ﴿نجيناكم﴾ میں (نجينا) النجوة سے ہے، جو اونچی زمین کو کہا جاتا ہے، پھر اسی سے ہر کامیاب ہونے والے اور ہلاکت سے بچ نکلنے والے کو (ناجی) کہا جاتا ہے۔

﴿آل فرعون﴾ (آل) اصل میں (أهل) ہے، پھر ھا کو الف سے بدلا تو (آل) ہوا۔ ہر اس شخص کو (آل فلان) کہا جاتا ہے جو اس کی طرف نسبی یا سببی طور پر منسوب ہو، یعنی رشتہ یا نظریاتی ہم آہنگی کے لحاظ سے نسبت ہو۔آل اور اہل میں استعمال کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ (آل) صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور (أهل) عام ہے۔ لفظ اہل معرفہ اور نکرہ دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔جبکہ (آل) صرف مخصوص اور مشہور شخصیات کے لیے آتا ہے۔یہ جمہور مفسرین کی رائے ہے، لیکن حافظ ابن القیمؒ جلاء الأفهام میں (آل) کا اصل أهل قرار دینے کو چھ وجوہات سے ضعیف قرار دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آل اور اہل کے مابین عرب کے استعمال میں فرق ہے، اگر دونوں ایک ہوتے تو یہ فرق نہ ہوتا۔ اور کہا ہے کہ آل اصل میں (أول) ہے، جو (آلَ یَـــؤُولُ) سے مشتق ہے۔ اس کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ کیونکہ انسان کے اہل وعیال کی نسبت اسی کی طرف لوٹتی ہے، وہی ان کا مرجع اور مآل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

(فرعون) مصر کے جتنے بادشاہ قبیلہ عمالیق یا دوسرے قبائل سے ہوتے تھے، ان سب کو "فرعون" کہا جاتا تھا۔ جیسے کہ روم کے بادشاہ کو قیصر، فارس کے بادشاہ کو کسریٰ، یمن کے بادشاہ کو تبع، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی، ہندوستان کے بادشاہ کو بطلیموس اور ترک بادشاہ کو خاقان کہا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ بعض نے مصعب بن ریان بھی کہا ہے۔ اور اہل کتاب کے ہاں اس کا نام قابوس ہے۔ بعض کے نزدیک ہر سرکش کو فرعون کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: (تفرعنَ الرجلُ) فلان شخص سرکش ہوگیا۔ (آل فرعون) سے مراد فرعون کا لشکر اور اس کے پیروکار ہیں۔

﴿یسومونکم﴾ وہ تمہیں تکلیف پہنچاتے تھے، یا وہ تمہیں چکھاتے تھے۔ کہا جاتا ہے (سامه الأمر) اس کو تکلیف پہنچائی۔ (سامه نسفا) اسے ذلیل کیا۔ اور بعض اس کے معنی یوں بیان کرتے ہیں "وہ تمہیں ہمیشہ عذاب دیتے رہے۔" کیونکہ (السوم) دوام کو کہا جاتا ہے۔ (سائمة الغنم) ان بھیڑ بکریوں کو کہا جاتا ہے جو اکثر سال چرتی رہتی ہیں۔

﴿سوء العذاب﴾ بدترین اور سخت ترین عذاب۔ (یسومونکم سوء العذاب) آل فرعون بنی اسرائیل سے بہت سخت مشقت والے کام اور خوب خدمت لیتے تھے۔ اور جو اس کے لیے آمادہ نہ ہو تو اس پر ٹیکس عائد کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں ﴿یسومونکم سوء العذاب﴾ کی تفسیر اس کے بعد مذکور ہے: ﴿یذبحون أبناء کم﴾ یعنی وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کر کے تمہیں عذاب دیتے تھے۔ یہاں پر (یذبحون) سے پہلے (واو) عاطفہ آیا ہے جو اس قول کو زیادہ قوی بناتا ہے کہ ﴿یسومونکم سوء العذاب﴾ اور ﴿یذبحون أبناء کم﴾ دونوں کی مراد مختلف ہے۔ بعض نے اس کا جواب دیا ہے کہ واو زائدہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ (واو) تفسیر یہ ہو۔ دونوں اقوال یہاں محتمل ہیں۔ واللہ اعلم

﴿یذبحون﴾ باب تفعیل سے ہے، جس میں مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ کثرت کے ساتھ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتے تھے۔ اور سورۃ الاحزاب آیت ۱۴۱ میں ﴿یقتّلون أبناء کم﴾ آیا ہے۔ اس سے مراد قتل بمعنی ذبح ہے، یا دونوں کا معنی مختلف ہے کہ ذبح گردن پر چھری پھیر کر رگوں کو کاٹ کر مارنا ہے اور قتل اس سے عام ہے۔ یعنی وہ بعض کو ذبح کرتے تھے اور بعض کو قتل کرتے تھے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ذبح خاص اور قتل عام ہے تو عام کو خاص پر محمول کیا جائے۔

﴿أبنـــاء کـم﴾ یعنی جب بھی بنی اسرائیل میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا، تو فرعون کے لشکری اسے قتل کر ڈالتے تھے۔

﴿ویستحیون نسآء کم﴾ یعنی وہ بچیوں کو قتل نہ کرتے؛ بلکہ اپنی خدمت کے لیے زندہ چھوڑتے تھے۔اس سے ان کی تذلیل وتوہین ہوتی تھی۔(نسآء کم) امرأۃ کی جمع ہے، جو عورت کو کہا جاتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ وہ ان کی بچیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ان کو انجام کے لحاظ سے (نسآء) کہا ہے۔واللہ اعلم یا (نسآء) جنس ہے جو (بنات) کو بھی شامل ہے۔

﴿وفی ذٰلکم بلآء من ربکم عظیم﴾ (بلآء) کے اصل معنی آزمائش اور امتحان کے ہیں۔اور امتحان بھلائی اور برائی دونوں کے ساتھ ہوتی ہے؛ جیسے کہ ارشاد ہے:﴿وبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلھم یرجعون﴾ [الأعراف ۱٦۸]،﴿ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ﴾[الأنبیاء ۳۵]

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:''عموماً (بلوتہ بلاء) برائی کی آزمائش اور (أبلیتہ وأبلیہ إبلاء وبلاء) خیر کی آزمائش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔'' زیر تفسیر آیت مبارکہ میں دونوں معنوں کا احتمال پایا جاتا ہے۔اگر (وفی ذٰلکم) اسم اشارہ سے مراد فرعون کے مظالم سے نجات ہو تو (بلاء) بمعنی ''بڑی نعمت'' ہوگی۔اور یہ تفسیر حضرت ابن عباس سے ثابت ہے اور حضرت مجاہد وغیرہ سے بھی وارد ہے۔اور اگر اسم اشارہ سے فرعون کے مظالم اور بیٹوں کو ذبح کرنا ہو تو (بلاء) بڑے شر اور بڑی مصیبت کے معنی میں ہوگا۔اسی قول کو امام قرطبی نے جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔(عظیم) یہ (بلاء) کی صفت ہے، یعنی ''بڑی آزمائش'' [تفسیر الطبری،القرطبی،ابن کثیر،البغوی الشوکانی،البیضاوی،ابن العثیمین،التفسیر الصحیح،جلاء الأفھام ص ۲۲۷-۲۳۰]

﴿وإذ فرقنا﴾ یہ جملہ سابقہ آیت ﴿وإذ نجیناکم﴾ پر عطف ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جب تم ان سے بھاگ رہے تھے اور وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے۔جب تم بحر قلزم کے قریب پہنچ کر دشمنوں کے ہتھے چڑھنے والے تھے؛ تو اس مشکل گھڑی میں ہم نے دریا کو روک کر تمہارے لیے راستے بنا دیے۔آیت مبارکہ میں نجات کا سبب اور کیفیتِ نجات کی تصویر کشی ہو رہی ہے۔

(إذ) اس وقت کو یاد کرو۔ (فرقنا) ''فرق'' اصل میں الگ اور جدا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔اسی سے مانگ نکالنے کو بھی فرق کہتے ہیں۔قرآن مجید کا بھی ایک نام (فرقان) ہے، جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔غزوہ بدر کے دن کو بھی ''یوم الفرقان'' اسی لیے کہا جاتا ہے۔

(بکم) میں (با) بعض کے نزدیک (لام) کے معنی میں ہے۔یعنی ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ ڈالا۔اور بعض کے ہاں (باء سببیہ) ہے۔یعنی تمہارے دریا میں داخل ہونے کی وجہ سے (تمہیں آزادی دینے کے لیے م ت) ہم نے دریا

کو پھاڑ ڈالا۔ اسی معنی کو امام قرطبی نے ترجیح دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے ﴿أن اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم﴾ [الشعراء ٦٣] جب حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری تو اسی وقت دریا پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا حضرت موسیٰ کے لاٹھی مارنے پر دریا رک گیا اور ان کے لیے راستہ بن گیا۔ اسی معنی کو امام قاسمی نے راجح قرار دیا ہے۔ ﴿وإذ فرقنا بکم البحر﴾ میں (البحر) اصل لغت میں بہت زیادہ وسیع چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے تیز رفتار گھوڑے کو "بحر" کہا جاتا ہے جیسے آپ ﷺ نے حضرت ابوطلحہ کے گھوڑے کو کہا تھا "وإن وجدناه لبحراً" اسی طرح کہا جاتا ہے: "تبحر فی العلم واستبحر فی المال" وسیع العلم ہوا اور کثیر المال ہوا۔ اسی سے کثرت سے پانی جمع ہونے کی وجہ سے سمندر اور بڑے دریا کو "بحر" کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد بحر قلزم ہے۔ علامہ قاسمی فرماتے ہیں یہ (بحر السویس) کے نام سے مشہور ہے۔

جب تمام بنو اسرائیل سکون کے ساتھ دریا پار کر گئے، تو انہی راستوں سے فرعون اور اس کے فوجی گزرنے لگے۔ اب اللہ کے حکم سے دریا اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور ان سب کو غرق کر دیا۔ ﴿وأنتم تنظرون﴾ جملہ حالیہ ہے، یعنی تم دوسرے کنارے پر پہنچ کر اپنے دشمنوں کے غرق ہونے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کے غرق ہونے کا منظر قدرے تفصیل سے بیان فرمایا ہے: ﴿فأتبعوهم مشرقین ۞ فلما تراء ا الجمعٰن قال اصحاب موسٰی إنا لمدرکون ۞ قال کلا ان معی ربی سیهدین ۞ فأوحینا إلٰی موسىٓ أن اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم ۞ وأزلفنا ثَم الأخرین ۞ وأنجینا موسٰی ومن معهٗ أجمعین ۞ ثم أغرقنا الأخرین ۞﴾ [الشعراء ٦٠-٦٦] "پس فرعونی سورج نکلتے ہی ان کے تعاقب میں نکلے، پس جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے۔ موسیٰ نے کہا: ہرگز نہیں، یقین مانو کہ میرا رب میرے ساتھ ہے، جو ضرور مجھے راہ دکھائے گا۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ دریا پر لاٹھی مار، پس اسی وقت دریا پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند ہو گیا۔ اور ہم نے اسی جگہ دوسروں کو نزدیک لا کھڑا کر دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی۔ پھر دوسروں کو ڈبو دیا۔" [التفاسیر: الطبری، القرطبی، الشوکانی، القاسمی، ابن العثیمین]

دونوں آیتوں سے مستنبط فوائد:

فائدہ نمبر1: دونوں آیتیں دلالت کرتی ہیں کہ فرعون اور اس کے پیروکار بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑتے تھے،

فرعونیوں کا بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا سلسلہ حضرت موسیٰ کی نبوت سے پہلے تھا یا بعد میں؟ اس میں دو اقوال ہیں:

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ بعض قرآنی آیات سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ ﴿فلما جآء هم بالبينات قالوا اقتلوآ أبنآء الذين آمنوا معه واستحيوا نسآء هم﴾ [غافر ۲۵] ﴿وقال الملأ من قوم فرعون أتذر موسىٰ وقومه ليفسدوا في الأرض ويذرك والهتك قال سنقتل أبنآء هم ونستحي نسآء هم وإنا فوقهم قاهرون﴾ [الأعراف ۱۲۷]

۲۔ بعض مؤرخین کے نزدیک یہ ظلم حضرت موسیٰ کی ولادت سے پہلے شروع ہوا تھا۔ زیر تفسیر آیت کے پس منظر میں اسرائیلی روایات کے مطابق فرعون نے ایک خواب دیکھا، جس کی تعبیر کرتے ہوئے کاہنوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری حکومت کا خاتمہ اور تیری ہلاکت ہوگی۔ اس پر بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل شروع کیا۔ اس کی تائید میں کہتے ہیں: اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی ماں کی طرف الہام کر کے بچے کو دریا میں پھینکنے کا حکم دیا تھا: ﴿أن أرضعيه فإذا خفت عليه فألقيه في اليم.....﴾ [القصص ۷] لیکن آیت میں صراحت نہیں کہ موسیٰ کی والدہ کا یہ فعل قتل کے خوف سے تھا؛ بلکہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا کوئی اور سبب ہو۔☆ واللہ اعلم [ابن العثیمین]

فائدہ نمبر۲: دونوں آیتوں میں بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہے؛ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو ان کے جانی دشمنوں سے نجات دی۔

۲۔ بنو اسرائیل کو نجات ملنے کا تاریخی واقعہ بھی اللہ کا عظیم احسان تھا۔ فرعون اور اس کے لشکر ان کو ختم کرنے کے لیے پیچھا کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل نجات کے ظاہری اسباب نظر نہ آنے پر بڑے ناامید ہو گئے تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مشکل ترین موقع پر حضرت موسیٰ کے ذریعے ان کی غیبی مدد فرما کر چلتے دریا سے خشک راستہ بنا کر انہیں نجات دی۔

۳۔ جب انسان کے جانی دشمن کی اذیتوں کی کوئی انتہا نہ ہو، تو مظلوم انسان کے اندر اس ظالم دشمن کی ہلاکت کی شدید رغبت ہوتی ہے۔ اگر ایسی حالت بن جائے کہ اسے نجات ملے اور اس کا ظالم دشمن اس کے سامنے ہلاک ہو رہا ہو تو

☆ منصوص علیہ "**خوف**" کی اور کوئی "**وجہ**" ثابت نہ ہونے کی بنا پر دوسرے قول کی قبولیت میں کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ آیات میں پہلے کے قتل کی نفی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے اس **خواب** کے خوف سے یہ ظلم شروع کیا ہو۔ بعثت موسوی کے بعد تو اس کی **تعبیر** روکنے کی غرض سے بنی اسرائیل کو کمزور کرنے کے لیے یہ سلوک پھر شروع کیا گیا۔ واللہ اعلم (ابو محمد)

اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور خوشی میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کو وہ اللہ کی طرف سے نعمت در نعمت گردانتا ہے۔ یہی معاملہ اللہ کے فضل سے بنی اسرائیل اور فرعونیوں کے ساتھ ہوا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو صرف نجات نہیں دی؛ بلکہ انہیں ان کے دشمن (فرعونیوں) کے باغات، مال و دولت اور خزانوں کے وارث بھی بنا دیا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿فأخرجناهم من جنٰت وعيون ۞ وكنوز ومقام كريم ۞ كذلك وأورثناها بنىٓ اسرائيل ۞﴾ [الشعراء ۵۷-۵۹، القرطبی، ابن العثیمین]

یاد رہے کہ بنی اسرائیل پر اتنی زیادہ نعمتوں کے باوجود وہ انتہائی ناشکری اور سرکش قوم نکلی، جو اپنے نبیوں کی تکذیب اور ان کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ [ابن العثیمین]

فائدہ نمبر۳: ﴿وأغرقنا ال فرعون﴾ آل فرعون سے مراد اس کے تمام پیروکار ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "آل فلان" جہاں شخص کے اہل وعیال کو کہا جاتا ہے، وہاں اس کے پیروکاروں اور اس کے نظریہ اور منہج پر چلنے والوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ [ابن العثیمین] اسی قرآنی اسلوب سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء کے ہاں ہمارے نبی ﷺ کے "آل" سے مراد "تمام امتی" ہیں۔ کیونکہ آدمی جتنا بڑا ہوگا، اس کا "آل" اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

فائدہ نمبر۴: امام ابن جریر الطبری فرماتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ آل فرعون بنی اسرائیل کو مختلف اذیتیں پہنچاتے تھے۔ لیکن فرعونی لشکر یہ کام فرعون کے حکم سے کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس فعل کی نسبت فرعون کے بجائے آل فرعون کی طرف کی ہے، کیونکہ وہ (آل فرعون) اس عمل بد کے عملاً تنفیذ کرنے والے تھے۔ اسی سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ کسی کے حکم پر کوئی قتل کرے یا کسی قسم کی تکلیف دے تو وہ قاتل یا تکلیف پہنچانے والا بھی مجرم ٹھیرایا جائے گا، اگرچہ حکم دینے والا کوئی طاقتور بادشاہ یا چور اور ڈاکو کیوں نہ ہو؛ جو اس کام پر اس کو مجبور کر رہا ہو۔ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں مذکورہ مسئلے کی مختلف صورتیں اور ان میں علماء کے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں۔ [الطبری، القرطبی]

فائدہ نمبر۵: (وفى ذلكم بلآء من ربكم عظيم) اور یہ تمہارے رب کی طرف سے عظیم آزمائش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اپنے بندوں میں مطلق طور پر تصرف کرنے کا حق ہے، خواہ وہ تصرف بندہ کو بھلا لگے یا نہ لگے۔ بلکہ صحیح حدیث کے مطابق جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مصیبت میں مبتلا کر دے، اس پر وہ مؤمن صبر و رضا سے کام لے، تو یہ اللہ کے ہاں بڑا اجر پانے کا ذریعہ ہوگا۔ اگر اس کے حق میں اللہ خیر کا فیصلہ فرماتا ہے، تو بندہ اس پر شکر کرے تو یہ بھی

اس کے لیے بہتر ہے۔[القرطبی، ابن العثیمین] مصائب ومشکلات سے نکالنے والا صرف اللہ ہے۔ جب کسی قوم پر نکبت وادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہوں تو افراد کو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر کے اپنا راستہ سیدھا کرنا ضروری ہے۔[الفرقان]

فائدہ نمبر۶: فرعون کو جن چیزوں پر فخر اور ناز تھا، انہی کے ذریعے اسے ہلاک کر دیا۔ وہ اپنے محلات کے نیچے بہتے دریاؤں پر فخر کرتا تھا، تو اسی دریا میں اسے ڈبو کر نشانِ عبرت بنا دیا۔ اور اس کی سرزمین کا وارث حضرت موسیٰ کی قوم کو بنا دیا، جس کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا یہ حقیر شخص ہے اور فصاحت سے بول بھی نہیں سکتا۔ ﴿یا قوم أ لیس لی ملک مصر وھذہ الأنھار تجری من تحتی أ فلا تبصرون ۞ أم أنا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین ۞﴾ [الزخرف ۵۱-۵۲، ابن العثیمین]

فائدہ نمبر۷: دونوں مبارک آیات میں بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر وہ چاہے تو بہتے دریا کو کھڑا کر کے خشک راستہ بنائے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے لیے بنایا تھا۔ بعض آثار میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے قبیلوں کے مطابق دریا میں بارہ راستے بنائے۔ ان بارہ گلیوں میں روشن دان بھی تھے، جس سے گزرتے وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر انہیں اطمینان ہوتا تھا۔ اگر یہ آثار صحیح ہوں تو کوئی بعید نہیں ہے۔ بلکہ یہ حضرت موسیٰ کے لیے ایک بڑا معجزہ تھا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: ''کسی بھی نبی اور رسول کے ہاتھوں جو بھی معجزہ ظاہر ہوتا تھا تو ہمارے نبی ﷺ کے لیے بھی اس کی طرح کوئی معجزہ عطا ہوتا تھا، یا آپ کے کسی امتی کے ہاتھوں اسی طرح کی کرامت ظاہر ہوتی تھی۔

علماء فرماتے ہیں کرامات اولیاء اصل میں معجزاتِ انبیاء ہوتے ہیں، یعنی کسی ولی کے ہاتھوں کرامت کے ظاہر ہونے سے اس نبی کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ اس ولی کی اپنے نبی کی متابعت اور اس کے ساتھ سچی محبت کی وجہ سے ہے۔ پھر حافظ ابن کثیر نے متعدد مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں سے حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی رسول کا بہتے ہوئے دریا پر چلنا قابل ذکر ہے۔ بلکہ اس طرح کے بعض واقعات میں بنی اسرائیل کے لیے دریا کو روک کر راستہ بنانے اور ان کے خشک زمین پر چلنے سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ واللہ اعلم [البدایة والنھایة ۶/۹۴۴-۶۶۸، ابن العثیمین]

فائدہ نمبر۸: معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کی زندگی انتہائی ذلت آمیز زندگی ہے۔ اور یہ بڑا عذاب ہے، جس سے انسان کا ذہن مفلوج اور اس کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس غلامیت سے نجات پا کر آزادی اور حریت کا حصول اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل کو جس دن نجات ملی، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دن شکرانے کا روزہ رکھتے تھے۔ یہ واقعہ عاشوراء (۱۰ محرم) کو پیش آیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے